تبسم کاشمیری *

بابو گوپی ناتھ: قحبہ خانوں کا راہب

وہ انسانی ذات کے نہاں خانوں سے دریافت ہونے والا ایک وجود ہے جو انسانی تہذیب کے گورکھ دھندوں میں گناہ اور آلودگی میں زندگی بسر کرتا ہوا یک لخت اپنے آپ کو منقلب کر کے ایک نئی سائیکی اور ایک نئے وجود میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ کل تک وہ کیا تھا یہ سب کو معلوم تھا اور آج وہ جو کچھ بننے والا تھا یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ اس کی سائیکی میں کایا کلپ کا عمل حیرت انگیز تھا۔ اور حیرت اس بات پر بھی ہے کہ وہ کایا کلپ کی منزل تک اتنی تیزی سے کیوں کر پہنچ گیا تھا۔ قحبہ خانوں کے راہبوں کی زندگی قحبہ خانوں کے درودیوار ہی میں گذرتی ہے اور کسی بھی تبدیلی کے بغیر بالآخر وہ قبر کی دیواروں یا آگ کے شعلوں میں اتر جاتے ہیں۔ یہ بابو گوپی ناتھ بھی عجیب ہے۔ زینت کی وجہ سے وہ اپنی سائیکی کی کایا کلپ کرتا ہے۔ اس کی شادی کرتا ہے اور پھر اپنا مستقبل رنڈی کے کوٹھے یا پیر کے تکیے کے سپرد کر دینے کا اعلان کر دیتا ہے۔ یہ اس کی اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان ہے۔ اس پر کوئی خوف ڈیرہ ڈالتا ہوا نہیں ملتا۔ نہ موت کا خوف اُسے ستاتا ہے اور نہ ہی مستقبل کا خوف، حیرت انگیز طور پر وہ مطمئن نظر آتا ہے۔ تعجب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماضی کی آلودگی کا ذکر نہیں کرتا۔ روایتی راہبوں کی طرح گناہ گار ماضی کے لیے توبہ کا طلب گار بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی جنت کی کھڑکی کھلوانے کے لیے اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ زوالِ عمر کو ایک فطری فعل تصور کرتا ہے اور موت کو اس فطری فعل کا نقطۂ آخر سمجھتا

ہے۔ یہ سب کچھ اس کے فہم میں موجود ہے۔

بابو گوپی ناتھ نے انتہائی پر تعیش زندگی بسر کی تھی۔ اس کا ماضی مسرتوں سے سرشار رہا تھا۔ اس نے اپنی مالی خوش حالی سے زندگی کی ہر مسرت کو خرید لیا تھا۔ اس کا بسیرا شہر کے بڑے سے بڑے کوٹھے پر رہتا تھا۔ پھر عمر کے دورِ آخر میں وہ ہمہ گیر زوال کا تجربہ کرنے لگا تھا۔ اسے عمر کے زوال کا تو خوف نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ ایک فطری عمل تھا جس سے گریز ممکن نہ تھا مگر مالی وسائل کے سکڑنے کا خوف پریشان کن تھا۔ یہ مالی وسائل کے خشک ہونے کا خوف ہی تھا جس نے اسے جلد از جلد زینت کی آبادکاری کا رستہ دکھا دیا تھا اور وہ اس حقیقت کو سمجھ کر پوری تندہی اور دل جمعی سے اس کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ وسائل کو اجڑتے ہوئے دیکھ کر انھیں برے دنوں کے لیے بچانے کی سعی کرتا مگر گوپی ناتھ عجب آدمی تھا کہ ایسے موقعوں پر پہلے سے زیادہ دولت صرف کرنے لگا تھا۔ یوں لگتا ہے اسے دولت صرف کرنے کی جلدی تھی اور اس عمل میں اس کی سائیکی پُرسکون طور پر مسرور ہو رہی تھی۔

اس کی زندگی کے آخری ایام کو دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ وہ اپنے ماضی کے کردار سے دل برداشتہ اور مایوس ہو کر بے معنویت کا شکار ہو جائے گا اور ماضی کا تاسف اسے بے معنویت کی دلدل میں پھینک دے گا مگر ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ اس کے بالکل برعکس بابو گوپی ناتھ باطنی معرفت اور زندگی کی معنویت کو دریافت کر لیتا ہے۔ اب اسے کوٹھے کی مسرت کی جگہ انسانی زندگی کی آبادکاری میں مسرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاید اس نے پہلی بار زندگی کی اس معنویت کا تجربہ کیا تھا۔ اب تک اس نے زندگی کی معنویت کو جنسی تجربے میں محسوس کیا تھا مگر اس بار انسان کو آباد کرنے اور اسے انسانی مسرتوں کے قریں کرنے سے یہ معنویت حاصل ہوئی تھی۔ اس بار اس کا بدن ہی نہیں اس کی سائیکی بھی مسرور ہوئی تھی۔ وہ ایک عجیب انسانی صورتِ حال کا تجربہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی بدنی مسرتوں کی نفی کو قبول کرتا ہے۔ اور زینت کی بدنی مسرتوں کا اقرار کرتا ہے۔ یہ نفی اور اقرار اس کی سائیکی کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ بابو گوپی ناتھ کی فتح زینت کے لیے مسرتیں فراہم کرنے میں ہے۔ زندگی کی اس منزل میں بابو گوپی ناتھ یہ جان چکا ہے کہ زندگی کا مزہ مسرت لینے میں نہیں مسرت دینے میں ہے۔

منٹو کے افسانوی اسٹیج پر بیشتر کردار جنسی کھیل کے سلسلوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کچھ کردار جنسی مسرتوں کا سفر طے کرتے ہیں اور یہ مسرتیں ان کو لازوال اشتہاؤں کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ ''بو''[۱] کا رندھیر گھاٹن لڑکی کے بدن سے پھوٹنے والی جنسی اشتہا کو کبھی فراموش نہ کر سکا۔ یہ جنسی اشتہا اسے جنسی سطح پر منجمد (freeze) کر دیتی ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت''[۲] کے ایشر سنگھ کی اشتہا کو مردہ لڑکی کا ٹھنڈا گوشت ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ مگر بابو گوپی ناتھ جنسی طور پر انجماد کا شکار نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی موت کا خوف اس کی جنس کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ بابو گوپی ناتھ جنس سے از خود سبک دوش ہوتا ہے اور یہ سبک دوشی زندگی کی معنویت کو سمجھنے کے ادراک سے پیدا ہوتی ہے اس نوعیت کا کوئی دوسرا کردار منٹو کے افسانوی اسٹیج پر دکھائی نہیں دیتا۔ یہ منٹو کا بے حد منفرد کردار ہے یہ بظاہر تو بہت سادہ ہے مگر اس کی سائیکی کے نہاں خانوں سے بہت کچھ برآمد ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ بابو گوپی ناتھ کی جبلتوں پر خزاں چھا گئی تھی۔ قحبہ خانوں کے راہب کے لیے یہ انشراح صدر کا معاملہ ہے۔ کسی بھی انسان پر کسی بھی وقت حقیقت کے انشراح کا یہ مرحلہ آ سکتا ہے مگر اس مرحلے پر انشراح حال کے مطابق جبلتوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا ایک معرفت کی کیفیت سے گذرنا ہے یہ ایک صوفیانہ طرزِ احساس ہے جہاں دنیاوی مال واسباب کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ اس حالت کو ترک کر دینے کی واردات میں روشنی کی منزل عطا ہوتی ہے۔ میں اسے عطا ہی کہوں گا کیونکہ بابو گوپی ناتھ اس روشنی تک گیان دھیان میں اتر کر نہیں پہنچا تھا۔ یہ انشراح کی کوئی گھڑی تھی جو اسے اس عطا سے سرفراز کر گئی تھی۔ بابو گوپی ناتھ جنس کا ہدف رہا تھا۔ زندگی بھر جنس شریکِ غالب کی حیثیت سے اس پر غالب رہی تھی اور اس نے مغلوب جنسی زندگی بسر کی تھی مگر یہ زندگی کی معرفت، معنویت اور انشراح کا غلبہ تھا کہ اس کی مغلوب جنسی زندگی جنس کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک نئے طرزِ احساس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی تھی۔ گذشتہ زندگی اس نے جنسی غلبے سے مغلوب ہو کر گذاری تھی اور اب وہ جنس پر غالب آ چکا تھا۔ جنسی جذبے سے مغلوب ہونے اور اس پر غالب آنے تک اس نے ایک لمبا سفر طے کیا تھا۔

بابو گوپی ناتھ کے کردار میں ایک بات سمجھنے کی ہے اور اس بات کا تعلق اس کی شخصی تہذیب

کی شناخت سے ہے۔اس نے کبھی بھی اپنے آپ کو تہذیب کے معروف کرداروں سے شناخت نہیں کیا۔ وہ اپنے آپ کو سوسائٹی کے مہذب کرداروں کا حصہ نہیں سمجھتا ہے اور سمجھتا بھی کیسے کہ وہ عام معنوں میں کوئی مہذب کردار تھا ہی نہیں ۔وہ تو قحبہ خانوں کی بدنام دنیا کا ایک کردار تھا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ قحبہ خانوں کی دنیا کا ایک راہب تھا جسے اس کی سوسائٹی کے لوگ سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ اس راہب کو شناخت کرنے کے لیے اس کی نیک نام سوسائٹی کو ایک لمبے عرصے تک انتظار کرنے کی ضرورت تھی۔ بابو گوپی ناتھ یہ جانتا تھا کہ اس کی شناخت جن کرداروں سے ہو سکتی تھی وہ پیروں فقیروں اور کنجروں کے کردار تھے۔ یہ کردار اس کی ذات میں تحلیل ہو گئے تھے مگر بابو گوپی ناتھ کا کردار ان کرداروں میں تحلیل نہ ہو سکا تھا کہ وہ قحبہ خانوں کا راہب تھا۔ بابو گوپی ناتھ اپنے شخصی کلچر کی دنیا کے کرداروں کے بارے میں یہ کہتا ہے۔

> میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا .... رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔[۳]

لہٰذا بابو گوپی ناتھ کی شناخت فقیروں اور کنجروں سے ہوتی ہے اس کا عشق رنڈی کے کوٹھے اور پیر کے مزار سے ہے۔ یہ اس کے شخصی کلچر کی دنیا ہے جو بہت مختصر اور بہت محدود ہے۔اب سوال یہ ہے کہ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار اس کے لیے آئیڈیل کیوں ہیں؟ یہ آئیڈیل اس لیے ہیں کہ بابو گوپی ناتھ کو یہاں فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا نظر آتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔یوں دیکھا جائے تو بابو گوپی ناتھ بذاتِ خود کسی دھوکے کا شکار نہیں ہے۔اس کی ذات حقیقت شناس ہے، دنیا شناس ہے۔اس کی ذات میں آگاہی کا شعور موجود ہے۔وہ نہایت حقیقت پسند انسان ہے وہ رنڈی کے کوٹھے اور پیر کے مزار کو دھوکے کی جگہ سمجھتے ہوئے بھی اپنی آئیڈیل جگہ سمجھتا ہے۔ وہ بھی غالبؔ کی طرح 'لذتِ آزار' میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ وہ رنڈی کے کوٹھے اور پیر کے مزار سے دھوکا نہیں کھاتا۔ دراصل وہ اس دھوکے کا عادی ہو چکا ہے اس کی طبع اس دھوکے کے بغیر مسرور نہیں ہو سکتی ہے۔ بابو گوپی ناتھ 'دھوکے' سے عشق کرنے والا انسان ہے وہ اچھی

طرح جانتا ہے کہ رنڈی کا کوٹھا دھوکا ہے۔مگر اسے دھوکے سے عشق ہے۔اسے معلوم ہے کہ پیر کا مزار بھی دھوکا ہے پھر بھی وہ اس دھوکے سے محبت کرتا ہے۔اب دیکھیے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ وہ بے حد حقیقت پسند انسان ہے۔ دراصل وہ دھوکے سے نہیں حقیقت سے محبت کرتا ہے۔اپنے شخصی کلچر کے یہ دونوں مقامات اس کی حقیقت پسندی کی شہادت کے سامان مہیا کرتے ہیں۔رنڈی سے اس کی محبت حقیقت پسندانہ محبت ہے۔ وہ رنڈی کو بخوبی جانتا ہے۔اس کی بے وفائی کا تجربہ رکھتا ہے اس کے باوجود وہ گریزپا لذات کا اسیر ہے۔ یوں دیکھا جائے تو وہ لذات کی اسیری میں رہنے کا عادی ہے۔لذات سے رہائی کا طالب نہیں ہے کہ یہ طلب اس کی دنیا کو اجاڑ سکتی ہے۔اس لیے وہ اس طلب کی کبھی خواہش نہیں کرتا اور اسے ترک کرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا۔اس بات پر بھی غور کیجیے کہ اس کی زندگی کا حاصل، زندگی کا سٹیٹس کو(status quo) ہے وہ سٹیٹس کو(status quo) کی دنیا کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔اس کے شخصی کلچر کا حسن، اس کا رنگ اور اس کی مسرت اسی سبب سے ہے۔

زینت تک پہنچتے پہنچتے وہ بدن کی آزمائشوں کی آخری منزل پر آ چکا تھا۔اس منزل پر وہ سٹیٹس کو (status quo) کے اسلوب سے انحراف کرتا ہے۔اس مقام پر کچھ سوال اُبھرتے ہیں۔ زینت سے دست برداری اور زندگی کے سامنے ہتھیار پھینک دینے کی وجہ یہ تو نہیں کہ شاہدانِ بازاری کی محبتوں میں ایک بھرپور زندگی بسر کرنے کے بعد اب اس کا بدن تھک گیا ہے یا سیر ہو گیا ہے یا تعیشات کی آخری حدوں کو چھو لینے کے بعد وہ محسوس کرنے لگا ہے کہ یہ سب کچھ گذراں ہے، سراب ہے۔مہاتما بدھ بھی عیش وعشرت سے بیزار ہو کر گیان دھیان میں نکل گیا تھا۔

مگر بابو گوپی ناتھ مہاتما بدھ نہیں تھا۔ وہ عیش ونشاط کی دنیا سے اس لیے باہر نہیں نکل رہا تھا کہ وہ عیش وعشرت سے اکتا گیا تھا اور یا بدن کے اصراف سے جسمانی نظام زوال پذیر ہو گیا تھا۔مہاتما بدھ بیوی بچے کو چھوڑ کر ایک رات اپنے گھوڑے کھنکا پر سوار ہوا اور اپنے رفیق کو ساتھ لے کر اُرو ویلا کے جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا جو اس کے گیان دھیان کے مسکن بن گئے تھے اور وہ تیزی کے ساتھ اپنی ذات میں اترتا چلا گیا تھا۔مگر بابو گوپی ناتھ جنگلوں اور گپھاؤں کی طرف نہیں گیا۔ البتہ وہ اپنی ذات کی گپھاؤں میں ضرور اتر گیا تھا۔اس کی ذات ہی میں اُرو ویلا کے جنگل نمودار ہو گئے تھے۔ وہ

کب تک ذات کے ان داخلی تجربات سے گذرتا رہا، ہمیں یہ معلوم نہیں ہے۔ ہاں ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اُسے نروان کی روشنی ایک انسانی تمثال نے دی تھی اور یہ زینت کی تمثال تھی۔

زینت کے مسئلے پر وہ بالآخر کامیاب ہوا۔ یہ کامیابی اُسے جنگل کا رستہ نہیں دکھائے گی وہ رنڈی کے کوٹھے اور پیر کے تکیے کی راہ لے گا۔ وہ زندگی سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی زندگی کے تماشے میں رہے گا کہ رنڈی کا کوٹھا دولت اور بدن کا تماشا ہے اور پیر کا تکیہ روحانیات کی تماشا گاہ اور بابو گوپی ناتھ ہے پکا تماش بین!

بابو گوپی ناتھ پہلی بار رنڈی کے کوٹھے پر کب گیا۔ کہانی میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ یہ ماضی بعید کی بات معلوم ہوتی ہے اور منٹو کے نزدیک اس ذکر کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن یہ نظر آتا ہے کہ ایک بار ماضی بعید ہی کے کسی زمانے میں جب سیڑھیاں چڑھ کر وہ کوٹھے پر پہنچا تو بس دیکھتا رہ گیا اور پھر لمبے لمبے وقفوں کے لیے کوٹھے کا مقیم ہوتا رہا۔ آغاز میں وہ تماش بین بنا اور پھر ہوتے ہوتے وہ پکا تماش بین بن گیا۔ ایک بار کوٹھے پر چڑھنے کے بعد وہ کوٹھے ہی کا ہو کر رہ گیا۔ شاید وہ خود کو اس مٹی کا سمجھنے لگا تھا۔

باپ سے ملے ہوئے مکان رفتہ رفتہ فروخت ہوتے رہے اور یہ مکان اسے ایک پختہ کار تماش بین بناتے رہے۔ لگتا یہ ہے کہ وہ تیزی سے مسرتیں سمیٹنے میں مصروف رہا۔ جنسی سرشاری اُسے ہمہ وقت شاد کام اور شاداب کرتی رہی۔

جب وہ زندگی کی بلندیوں پر کھڑا تھا تو خوش تھا اور جب بلندیوں سے نیچے اُتر آیا تو پھر بھی خوش تھا۔ رنڈی اور ہوس کی سرشاریوں سے محروم ہو جانے کا اسے کوئی دکھ نظر نہیں آتا۔ وہ اس حالت میں بھی پرسکون اور شانت رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں زوال کے باعث پیدا ہونے والی نمی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ جانتا اور اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ایک دن یہ سب کچھ ہونے والا تھا۔ کہانی یہ بتاتی ہے کہ وہ اس دن کو گلے لگانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس کے پاس دو انتخاب تھے۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر فقیر کا تکیہ۔ یہ دونوں اس کے ذہنی کلچر کے مسکن تھے۔ اس کے ذہنی کلچر کا کوئی تیسرا مسکن نظر نہیں آتا۔ اس کی بساط صرف کوٹھے اور پیر کے تکیے تک ہی محدود تھی۔ زینت کی شادی کے موقعے سے پہلے

ہی اس کی تماش بینی کا پرسونا (persona) اتر چکا تھا۔ اور اب وہ آدمی نظر آ رہا تھا اور شاید منٹو نے یہ کہانی اس آدمی کو دکھانے کے لیے ہی لکھی تھی۔

زینت بابو گوپی ناتھ کی خواہش کا آخری شاہکار ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ خواہش کا یہ آخری شاہکار اس کے لیے شانتی اور شکتی کا سامان بن جاتا ہے۔ اس کا حوصلہ قابلِ داد ہے کہ وہ اپنے آخری شاہکار کو اپنے ہاتھ سے خود رخصت کرتا ہے۔ زندگی میں شاید آخری بار یا پہلی بار وہ مکتی کی اس منزل سے گذرا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی نمی مکتی کی شہادت دے رہی تھی۔ بمبئی میں پیسہ ختم ہونے پر وہ ایک بار لاہور آیا تھا۔ اس نے داتا دربار میں جا کر زینت کی شادی کے لیے دعا مانگی تھی۔ جب شادی ہو رہی تھی تو اس نے منٹو کو یہ کہا تھا کہ بھگوان نے اس کی سن لی ہے۔[۴] اس کی آنکھ میں نظر آنے والی نمی داتا صاحب اور بھگوان کے لیے تشکر کا اظہار بھی تھی۔

ایسے کاموں کے لیے جگر داری چاہیے اور بابو گوپی ناتھ واقعتا ایک جگر دار شخص تھا۔ زندگی کے جس اسلوب کو اس نے اختیار کیا تھا، یہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔ اسے اس اسلوب اور اپنے انتخاب سے عشق تھا۔ اسے اس عشق کے آغاز اور اس کے انجام کی بھی خبر تھی۔ پھر وہ اپنے منتخب کردہ اسلوب پر چلتا رہا۔ اس نے زندگی کو ایک گذراں تماشے کے طور پر قبول کیا تھا۔ وہ اس تماشے کا ایک ان تھک تماشائی تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس تماشے کو رواں رکھنے کی طاقت اس کی دولت میں ہے اور جب تک یہ دولت ہے تماشا جاری رہے گا۔ وہ اس تماشے میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ اسے زندگی کا کوئی دوسرا مصرف نظر ہی نہ آتا تھا۔ اس کی زندگی کی ایک ہی ڈگر تھی اور وہ اس ڈگر پر چلتا رہا۔ بابو گوپی ناتھ ایک آزاد منش انسان تھا۔ اس آزاد منش انسان کے لیے معمول کی عام زندگی اپنے اندر دلچسپی نہ رکھتی تھی۔ اسے رشتہ داروں سے غرض تھی نہ دوستوں سے اور نہ ہی اپنے اہلِ خاندان سے۔ وہ عام انسانوں جیسی زندگی نہ جیتا تھا۔ اس کی اپنی بنائی ہوئی دنیا تھی اور وہ اس دنیا کا خوش باش باسی تھا۔ اس کی دنیا کے دو گوشۂ عافیت تھے۔ ایک گوشۂ عافیت (ivory tower) تو رنڈی کا کوٹھا تھا اور دوسرا پیر کا تکیہ۔ وہ اپنی چاہت، خواہش اور طلب کے درمیان ان ٹاورز میں اپنا وقت گذارتا تھا۔ خواہش اسے رنڈی کے کوٹھے کی طرف کھینچتی تھی جو اس کی ہوس کی تسکین گاہ تھا۔ اس کی بدنی تکمیل کی طلب اس تسکین گاہ

میں ڈیرے ڈالے رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ خواہش کی سرشاری اس پر دیوانگی طاری کر دیتی تھی اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا یہی حقیقی دنیا ہے؟ کیا یہی سب کچھ ہے؟ رنڈی کا گوشۂ عافیت (ivory tower) جب اس کے لیے اکتاہٹ کا سبب بن جاتا یا اس کا دل بھر جاتا تو روحانی طلب کا دھوکا اسے دوسرے گوشۂ عافیت میں لے جاتا۔ یہ پیر کا تکیہ تھا۔ یہاں بھی اس کا دل مسرور ہوتا تھا۔

بابو گوپی ناتھ عمر کے آخری دور میں تسلسل کے ساتھ ایک خواب کی حالت میں تھا۔ وہ اس خواب کی عملی تعبیر دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ وہ یہ خواب لاہور میں دیکھتا رہا تھا۔ مگر اس کی عملی شکل نہ بن سکی تھی۔ پھر وہ بمبئی کا رخ کرتا ہے جہاں وہ اس خواب کو حقیقی شکل وصورت میں ڈھالنے کی سعی کرتا رہا۔ یہ زینت کی نئی زندگی کا خواب تھا۔ اسے ایک ایسے انسان کی تلاش تھی جو زینت کے مستقبل کی ضمانت بن سکے۔ وہ بہت حقیقت پسند انسان تھا وہ کسی نیک انسان کا متلاشی نہ تھا کہ یہ اس کا آدرش ہی نہ تھا۔ وہ اپنے ہی قماش کے کسی انسان کو ڈھونڈ رہا تھا اور اس تلاش میں اسے بالآخر سندھ کا ایک خوشحال زمیندار مل گیا تھا اور زینت رسمی طور پر اس کے سپرد کر دی گئی تھی اور یوں بابو گوپی ناتھ کا خواب پورا ہو گیا تھا۔

زینت کی شادی کے روز وہ بے حد خوش تھا۔ اسی خوشی کے عالم میں وہ منٹو کو لے کر اس کمرے میں گیا جہاں زینت سرخ زربفت کے لباس میں دلہن بنی بیٹھی تھی اس نے کہا ذرا کمرے میں جا کر دیکھیے کہ زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔ یہاں منٹو کا بیان دیکھتے چلیے:

> میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی...... دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے زینت سے کہا یہ کیا مسخرہ پن ہے۔
>
> زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ ''آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!'' اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

> مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اُس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا۔
>
> "منٹو صاحب! میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں ...... زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔"
>
> بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اُسے مجھ سے تھی، زخمی نظر آئی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ "خدا تمھیں خوش رکھے!"
>
> یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ...... بہت ہی دکھ بھری ملامت ...... اور چلا گیا۔[۵]

کہانی میں بابو گوپی ناتھ پہلی بار ایک جذباتی ردِعمل کا مظاہرہ کرتا نظر آتا ہے۔ وہ منٹو کے سامنے زینت کو دکھ پہنچانے پر احتجاج کرتا ہے۔ اس کی نہایت پرسکون شخصیت منٹو کی وجہ سے بے حد مجروح ہوتی ہے۔ مجروح زینت بھی ہوئی تھی اس کے آنسو چھلک پڑے تھے جنھیں بابو گوپی ناتھ نے محبت سے صاف کیا تھا۔ یہ گوپی ناتھ کی بے پناہ محبت کا اظہار تھا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ جس عورت سے بابو گوپی ناتھ کو بے حد پیار تھا، وہ اسے اپنے ہاتھوں سے کسی دوسرے شخص کے سپرد کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس علاحدگی کے تصور سے اس کی شخصیت میں کسی رنج، الم یا فراق کی کیفیات نہیں ملتی ہیں۔ وہ خود ختم ہو رہا ہے اور اس کی تمام تر کوشش ہے کہ اپنے ڈراپ سین سے پہلے پہلے وہ اپنے پرانے خواب کی عملی تعبیر دیکھ سکے اور اس نے یہ خواب عملی طور پر پورا ہوتے ہوئے دیکھا۔

کہانی یہ بتاتی ہے کہ بابو گوپی ناتھ نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو اتنا چاہا تھا۔

کہانی کے آخر میں بابو گوپی ناتھ کا جو دعائیہ انداز ہے اس میں سارے کا سارا گوپی ناتھ سمٹ کر آ گیا ہے۔ وہ تماش بین کے پرسونا (persona) سے نکل کر ایک اور ہی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ یہاں ہم ایک نئے بابو گوپی ناتھ کو دیکھتے ہیں۔ اس کا دنیاوی روپ غائب ہو جاتا ہے۔ اور یہاں ایک نئے گوپی ناتھ کا ظہور ہوتا ہے۔ منٹو نے چند لمحوں میں یہ دکھایا ہے کہ ایک کردار کی کایا کلپ کیسے

ہو سکتی ہے۔ ایک عیاش راہب کی جگہ ہمیں ایک آدمی نظر آنے لگتا ہے۔ آدمی ان معنوں میں کہ جن معنوں میں منٹو نے آدمی کی تعبیر پیش کی تھی۔ ''آدمی یا آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے یا کوئی اور چیز ہے۔''

کہانی کے اختتام پر بابو گوپی ناتھ کی داخلی شخصیت کی تہیں کھلتی ہیں۔ فن یہ ہے کہ منٹو نے جسم اور روح کو آمیخت (integrate) کر دیا ہے اور ایک ایسا لا زوال کردار وجود میں آ گیا ہے جس کی کوئی دوسری مثال اردو افسانہ پیش کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔

زینت کی رخصتی ایک ایسا استعاراتی عمل ہے کہ جس کی تعبیر کی کئی جہتیں نظر آتی ہیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے اور اسے دعا دینے کے بعد یوں لگتا ہے کہ بابو گوپی ناتھ ایک عجب طمانیت محسوس کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی میں تکمیل (fulfilment) کا وہ لمحہ تھا کہ جس کا وہ بڑی دیر سے منتظر تھا۔ یہ اس کے لیے مکتی حاصل ہونے جیسی کیفیت تھی جس میں وہ ابدیت (eternity) کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

زینت کی رخصتی سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اب وہ زندگی سے دست کش (withdraw) ہو رہا ہے اور یہ صورت اب اسے پیر کے تکیے یا رنڈی کے کوٹھے کی سمت لے جائے گی۔ وہ اپنی ذات میں سمٹتے سمٹتے ایک موہوم سے مقام پر آخری سانس لے سکے گا۔ اس کی ذات کی آگاہی اُسے یہ پیغام دے چکی ہے کہ اب اسے واپسی کے سفر پر بڑھنا ہے۔ بابو گوپی ناتھ جو کہ قحبہ خانوں کا راہب ہے اس سفر پر چلنے کے لیے تیار ہے۔ اب اس راہب کا باطن بہت قوی ہے۔ اسے نہ اپنے انجام کا کوئی خوف ہے اور نہ ہی موت کا صدمہ۔ یہ سب کچھ اس کے لیے حقیقت کا درجہ رکھتا تھا اور یہ سب کچھ وہ قبول کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔

> بابو نے ایک موقعے پر بڑی سنجیدگی سے زینت کے بارے میں خود یہ کہا تھا کہ:
> منٹو صاحب! مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں

> لیا۔میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گذارا کیا۔[۶]

جہاں تک زینت کا تعلق ہے، وہ وجودی بہاؤ میں بہنے والی ایک عورت تھی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اختیار اور انتخاب سے محروم تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھی جو اپنی خواہش سے جو کچھ چاہتے ہیں انتخاب کر سکتے ہیں۔ زینت تو منتخب کی جاتی تھی اور اس کے اندر انکار کرنے کی بھی سکت نہ تھی۔ بابو گوپی ناتھ اس کا انتخاب نہ تھا وہ گوپی ناتھ کا انتخاب تھی۔ زندگی میں اُسے انتخاب کرنے کا موقع ہی کب ملا تھا۔ ایک نابکار کٹنی اُسے کشمیر سے بھگا لائی تھی۔ وہ بے حد سادہ طبیعت کی عورت تھی۔ کٹنی نے اس کی سادگی ہی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ پھر وہ گوپی ناتھ کی صحبت میں رہی۔ اس نے زینت سے محبت کی۔ وہ اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ بمبئی میں بابو گوپی ناتھ کی پالیسی کے مطابق وہ کچھ لوگوں میں دلچسپی لیتی رہی ان کی یا اپنی جنسی خواہشیں بھی پوری کرتی رہی۔ ان میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ محبت نہ کرتا تھا۔ ردِعمل کے طور پر وہ بھی ان سے محبت نہ کر سکی۔ شاید اپنے ذاتی حالات سے وہ اتنی دل برداشتہ ہو گئی تھی کہ خود کو کرسی، میز یا مکان کی طرح مردوں کے استعمال میں آنے والی ایک چیز سمجھنے لگی تھی۔ زندگی اس کے لیے بےمعنی حقیقت بن گئی تھی۔ اس کی دلچسپی زندگی کی کسی چیز میں نہ تھی۔ اسی لیے اس کے بارے میں منٹو نے یہ لکھ دیا تھا کہ ''زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔''[۷] اس کے اندر کی بےمعنویت نے اس پر اس حد تک غلبہ حاصل کر لیا تھا کہ زندگی کی کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہ ہوتی تھی۔ وہ سگریٹ نوشی اور مے نوشی کرتی تھی مگر ان سے دلچسپی نہ تھی۔ کھانا ہو یا گھر یا ٹیلی فون یا وہ صوفہ جس پر وہ اکثر آرام کرتی تھی اسے ان سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ زینت زندگی کی مسرتوں اور لذتوں سے عاری عورت تھی۔ وہ محبت کے تجربے سے بھی محروم رہی تھی اور یہی اس کردار کا بڑا المیہ تھا۔ بمبئی میں قیام کے دوران میں جب بابو گوپی ناتھ روپے ختم ہونے کے خوف سے مزید روپے لینے کے لیے لاہور گیا تو اس کی غیر حاضری میں سردار بیگم کو ہر روز مورفیا کا ٹیکہ لگوانے کی ضرورت تھی اور سینڈو کو پولسن مکھن اور شراب کی ...... اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے تھے جو زینت کو استعمال کرتے اور سوسوا سو روپے سینڈو اور

سردار بیگم کو مل جاتے تھے۔ ایک روز جب زینت کو منٹو نے کہا ''یہ تم کیا کر رہی ہو'' تو اس نے بڑے الھڑ پن سے کہا ''مجھے کچھ معلوم نہیں بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔''[۸] زینت کا مسئلہ ہی یہ تھا کہ وہ مدافعت کی قوت سے محروم تھی اس لیے کسی بات پر انکار کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ زینت جیسے بے جان اور انفعال زدہ کردار کی طرف بابو گوپی ناتھ کیوں کر مائل ہوا تھا۔ عمر بھر حسیناؤں کی زلفوں اور غمزوں کے سائے میں رہنے والا آدمی ایک بے جان لڑکی سے محبت کیوں کرنے لگا تھا؟

ان باتوں کے باوجود زینت اس کے لیے ایک بامعنی تمثال تھی اور وہ اس بامعنی تمثال کو عزت و احترام سے رخصت کرنا چاہتا تھا اور واقعتاً اس نے ایسا کیا۔

بابو گوپی ناتھ اپنے اردگرد کے لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ یہ سب لوگ اسے دھوکا دے رہے ہیں مگر ہر روز دھوکا کھانے کے باوجود وہ ان سے تعلق ختم نہیں کرتا۔ اس کی سائیکی یہ کہتی ہے کہ دھوکا کھانے میں تو اسے مسرت محسوس ہوتی ہے مگر دھوکا دینا اس کی سرشت میں شامل نہیں ہے۔ وہ حقیقت سے زیادہ سراب کے پیچھے دوڑنے والا شخص ہے۔ فریب اور دھوکا اس کے لیے وجہِ تشفی ہیں۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ وہ دھوکے، فریب اور سراب کا متمنی کیوں ہے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ وہ عمر بھر سراب کے پیچھے بھاگتا رہا۔ سراب اس کے لیے حقیقت کا ایک روپ تھا مگر اس کی زندگی میں بالآخر ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب اسے حقیقت کا ادراک ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر سراب اس کے ماضی کا حصہ بن کر پیچھے رہ جاتا ہے اور وہ حقیقت کا سفر طے کرنے لگتا ہے۔ یہ حقیقت اس نے زینت کی شکل میں دیکھی تھی۔ کہانی کو سمجھنے کے لیے اب ہمیں کہانی کے متن میں بابو گوپی ناتھ کو مزید تلاش کرنا چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے جو لوگ اس کے آئیڈیل ہیں وہ کون ہیں؟ وہ پیر، فقیر اور کنجر ہیں۔ وہ ایک ہی سانس میں پیروں اور کنجروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ان دونوں میں فرق نہیں ہے۔ بقول بابو گوپی ناتھ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں۔ یعنی رنڈی کے کوٹھے پر اولاد بیچی جاتی ہے اور تکیوں میں نام نہاد پیر خدا کے نام کو بیچتے ہیں۔

جو مقامات اس کے آئیڈیل ہیں وہ ہیں رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ جگہیں آخر کیوں پسند ہیں؟ بابو گوپی ناتھ دھوکے، خود فریبی اور سراب کی دنیا میں رہنے والا شخص ہے اور یہ دنیا اس کی تسکین گاہ ہے۔ دھوکا کھانا اور جان بوجھ کر دھوکا کھانا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ یہ حقیقت پسندی کا اعتراف ہے۔ بابو گوپی ناتھ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ رنڈی کے کوٹھے پر حاصل کی جانے والی مسرت عارضی ہے، ظاہری ہے اور غیر حقیقی ہے اور یہی حال پیر کے تکیے پر ملنے والے سکون میں ہے۔ وہ رنڈی کے کوٹھے کی چمک دمک، پیار، محبت اور پیر کے تکیے سے ملنے والی تشفی کا عادی (immune) ہو چکا ہے۔ ان کے بغیر وہ زندہ رہ نہیں سکتا۔ یہ اس کا اسلوب زیست بن چکا ہے۔

بابو گوپی ناتھ منٹو کی کہانیوں میں اپنی نوعیت کا واحد کردار ہے۔ وہ مذہب سے ماورا ہے۔ کسی بھی مذہب پر اس کا یقین نظر نہیں آتا۔ وہ آدمی ہے، صرف آدمی۔ اگر اس کا کوئی مذہب، کوئی عقیدہ ہے تو آدمیت ہے اور یہی اس کی مخفی قوت ہے۔ اس نے کوٹھوں پر ایک بھرپور زندگی گذاری تھی، خواہشات کی تیز آندھیوں میں اڑتا رہا تھا، جبلتیں سر پر سوار رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ درویشوں کے تکیوں پر حاضری بھی دیا کرتا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی رہا آدمی بن کر رہا۔ جب تک اس کی دولت اور کمر میں دم خم تھا تو وہ آدمی تھا اور جب کمر کی طاقت سے محروم ہوا تو اس وقت بھی وہ آدمی ہی رہا۔ یہ بابو گوپی ناتھ کی مخفی قوت تھی جس نے اس کے ہر دور کو توانائی بخشی تھی۔

بابو گوپی ناتھ نے نیکی بدی، گناہ و ثواب کے تصورات سے ماورا ہو کر زندگی بسر کی۔ اس نے زندگی کو کبھی بھی نیکی بدی کے حوالے سے نہ دیکھا تھا۔ اس کے لیے زندگی، زندگی تھی جس میں وہ اپنے قرینے اور سلیقے سے زندہ رہا تھا۔

"بابو گوپی ناتھ" میں اگر کوئی آدمی نظر آتا ہے تو وہ بابو گوپی ناتھ ہی ہے۔ کہانی میں دوسرا آدمی موجود ہی نہیں ہے۔ سینڈو، غفار سائیں، سردار بیگم وغیرہ آدمی نہیں ہیں، یہ تو منٹو کی نظر میں گدھے، مکان اور میزیں ہیں یا پھر اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ یہ لوگ اس روشنی سے محروم ہیں جو ہم کہانی کے دروبست میں بابو گوپی ناتھ کی داخلی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ بابو گوپی ناتھ آدمی اس لیے ہے کہ عمر

بھر تماش بینی کرنے کے بعد بھی آدمی اس کے اندر موجود رہا اور بالآخر وہ لپک کر باہر آ گیا۔ دیگر کرداروں میں آدمی کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ ان کے اندر کا آدمی مسلسل غائب ملتا ہے۔

بابو گوپی ناتھ کی دنیا کے ان کرداروں کو بھی دیکھتے جایئے۔ یہ دیکھیے یہ غفار سائیں اور بقول منٹو تہمد پوش، پنجاب کا ٹھیٹ سائیں، گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں۔ کیونکہ وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی امید نہ تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ غلام علی ہے۔ لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، لاہور کی ایک بڑی طوائف کی بیٹی اس پر عاشق ہو گئی تھی مگر وہ لنگوٹ کا پکا نکلا۔ ایک تکیے میں بابو سے ملاقات ہوئی، اسی وقت سے ان کو چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا مقرر ہے۔ بابو کے فلیٹ کی دنیا میں سانولے رنگ کی ایک عورت بھی نظر آتی ہے جو سگریٹ پھونکتی رہتی تھی۔ یہ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم کہلاتی تھی۔ اس کے لیے بھی کریون اے کا ایک ڈبہ مقرر تھا اور ہر شام یہ ڈاکٹر سے مورفیا کا ٹیکہ لگواتی تھی۔ یہ لوگ اسے ہر روز دھوکا دیتے تھے اور بابو ہر روز ہنس کر ان کا دھوکا سہہ جاتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ ان کی عادت ہے اور یہ عادت بدل نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ دھوکا کھانے کا عادی ہے اور اپنی عادت بدل نہیں سکتا ہے۔ اس لیے دونوں فریق ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔

بابو گوپی ناتھ کو دیکھتے ہوئے مجھے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ بمبئی کی کلونیل دنیا کے گناہ گار کرداروں پر کہانیاں لکھتے لکھتے منٹو شاید تھک گیا تھا۔ اس نے کثیر مقدار میں ڈھیر سارے کردار افسانے کی دنیا کے سپرد کر دیے تھے۔ اس کی کہانی میں مرد کرداروں کا ایک ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ وہ سب کے سب مشین کی طرح کسی نہ کسی شکل میں گناہ، آلودگی، جنسی مسرت اور اسی قسم کے کاموں میں مصروف ملتے ہیں۔ ان کرداروں کے لیے اس مشینی زندگی سے ہٹ کر ادھر ادھر دیکھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ان کرداروں میں نارمل کردار بھی ہیں اور ابنارمل بھی۔ نارمل کردار بھی کسی نہ کسی ابنارمیلٹی کا شکار ہیں اور ویسے بھی منٹو کی ان نارمل کرداروں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

''بابو گوپی ناتھ'' کو پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے منٹو بڑی مدت سے کسی انسان کی

تلاش میں تھا۔ بابو گوپی ناتھ اسی انسان کا استعارہ معلوم ہوتا ہے جسے وہ مدتوں سے تلاش کر رہا تھا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں الجھوں گا کہ گوپی ناتھ انسان ہے یا نہیں۔کیا وہ محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں کا فطری انسان ہے یا ممتاز شیریں کا نامکمل انسان۔ یہ ساری سعی انسان کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔اس لیے میں یہ کہوں گا کہ اردو افسانہ بابو گوپی ناتھ جیسے استعاراتی انسان سے محروم تھا۔اس کے بارے میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ نوری ہے نہ ناری، وہ تو صرف انسان ہے اور منٹو نے اسی انسان کو دریافت کیا تھا اور یہ انسان صدیوں کے عمل میں بھی زندہ رہے گا۔تاریخ کے صفحات پر وہ کبھی بھی تحلیل نہ ہونے والا انسان ہے۔

حوالہ جات

- ٭ تبسم کاشمیری، پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور۔

۱۔ سعادت حسن منٹو، "بو" کلیات منٹو جلد اول، مرتب امجد طفیل (اسلام آباد: نیر یجوز،۲۰۱۲ء)، ص ۳۷۹۔۳۸۳۔

۲۔ سعادت حسن منٹو، "ٹھنڈا گوشت" کلیات منٹو جلد دوم، مرتب امجد طفیل (اسلام آباد: نیر یجوز،۲۰۱۲ء)، ص ۲۳۔۲۷۔

۳۔ سعادت حسن منٹو، "بابو گوپی ناتھ" کلیات منٹو جلد اول، مرتب امجد طفیل (اسلام آباد: نیر یجوز،۲۰۱۲ء)، ص ۴۳۸۔

۴۔ ایضاً، ص ۴۴۳۔

۵۔ ایضاً، ص ۴۴۴۔

۶۔ ایضاً، ص ۴۴۶۔

۷۔ ایضاً، ص ۴۴۲۔

۸۔ ایضاً۔

مآخذ

منٹو، سعادت حسن ۔ کلیات منٹو۔ جلد اول۔ مرتب امجد طفیل ۔اسلام آباد: نیر یجوز،۲۰۱۲ء۔

منٹو، سعادت حسن ۔ کلیات منٹو۔ جلد دوم۔ مرتب امجد طفیل ۔اسلام آباد: نیر یجوز،۲۰۱۲ء۔